IQBAL REVIEW (67: 1)
(January– March 2026)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

کارل مارکس کا نظریۂ طبقاتی کشمکش اور پنجابی شاعری

Class Struggle in the Thought of Karl Marx and Punjabi Poetry

ڈاکٹر ثوبیہ اسلم
Assistant Professor,
Department of Urdu & Oriental Languages,
Govt. College University, Faisalabad

ABSTRACT

This research article explores the manifestations of class conflict, economic inequality, and social exploitation in Punjabi poetry through the lens of Karl Marx's theory of class struggle. While Marx formally articulated the concepts of economic exploitation and class division in the nineteenth century, the study demonstrates that similar concerns had already been embedded in the folk wisdom, oral traditions, and poetic heritage of Punjab for centuries. Drawing upon Punjabi folk songs, proverbs, Sufi poetry, classical verse, and modern Punjabi literature, the article examines how poets and folk

creators have represented the unequal distribution of wealth, the hardships of laborers and peasants, and the dominance of privileged social classes. The study highlights the contributions of prominent Punjabi poets, including Baba Farid, Shah Hussain, Bulleh Shah, Ustad Daman, Sharif Kunjahi, Najm Hussain Syed, Afzal Ahsan Randhawa, Ahmad Saleem, and others, who addressed issues of poverty, exploitation, social injustice, and economic disparity in their works. The article further analyzes the relationship between Marxist thought and Punjabi literary discourse, identifying points of convergence between Marx's critique of capitalism and the socio-economic concerns reflected in Punjabi poetry. In addition, the study discusses the Islamic concept of economic justice, emphasizing the role of zakat, charity, and equitable distribution of wealth as mechanisms for reducing social inequality. The findings suggest that Punjabi poetry functions not merely as an artistic expression but also as a significant intellectual and social document that critiques unjust socio-economic structures and advocates human dignity, equality, and social justice. The article concludes that the themes of class conflict and economic inequality remain relevant in contemporary society, and Punjabi poetry continues to provide valuable insights into these enduring human concerns.

Keywords: Karl Marx; Class Struggle; Punjabi Poetry; Economic Inequality; Social Justice; Capitalism; Labor and Exploitation; Sufi Poetry; Folk Literature; Economic Justice.

کارل مارکس انیسویں صدی کا ایک ممتاز مفکر تھا جس نے فلسفہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، صحافت، سیاسیات اور سماجیات کے میدانوں میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کے افکار نے جدید دنیا کے سیاسی، معاشی اور سماجی مباحث کو ایک نئی جہت عطا کی۔ مارکس نے بالخصوص سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت (Capitalist Economic System) پر تنقید کرتے ہوئے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو انسانی معاشرے کے بنیادی مسائل میں شمار کیا۔ اس کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام اپنی داخلی تضادات اور ساختی خامیوں کے باعث پائیدار اور عادلانہ نظام ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں دولت چند افراد یا طبقات کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتی ہے، جبکہ محنت کش طبقہ اپنی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان معاشی اور سماجی فاصلے میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

طبقاتی تفاوت (Class Distinction) اور معاشی ناہمواری کا موضوع اردو اور پنجابی ادب میں ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے مختلف ادوار میں امیر و غریب کے درمیان موجود فاصلے، استحصال اور معاشرتی ناانصافی کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ دوسری جانب اسلامی معاشرتی نظام میں دولت کی منصفانہ تقسیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام زکوٰۃ، صدقہ، فطرانہ اور دیگر رفاہی ذرائع کے ذریعے معاشی توازن پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی طرح صوفیائے کرام کی خانقاہی روایت بھی معاشرتی مساوات اور اخوت کی عملی مثال پیش کرتی ہے، جہاں معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد بلا امتیاز ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر لنگر تناول کرتے ہیں۔ یہ روایت معاشی اور سماجی تفریق کے خاتمے کا ایک مؤثر مظہر سمجھی جاتی ہے۔

پنجابی شاعری میں طبقاتی امتیاز اور معاشی ناہمواری کا موضوع تقریباً ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت صرف برصغیر تک محدود نہیں بلکہ دنیا کی تقریباً تمام اقوام میں امیر اور غریب کے درمیان فرق واضح طور پر موجود رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے طبقاتی تقسیم ایک قدیم سماجی مظہر ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں آریاؤں کی آمد کے بعد مقامی آبادی کے ایک بڑے حصے کو "داس" (غلام) کا درجہ دیا گیا۔ بعد ازاں ذات پات کے نظام نے سماجی تقسیم کو مزید مضبوط کیا، جس کے نتیجے میں بعض طبقات کو مراعات حاصل ہوئیں جبکہ دیگر طبقات معاشی اور سماجی استحصال کا شکار رہے۔ برہمنی

سماجی نظام میں ویش، کھشتری اور شُودر طبقات کے باہمی تعلقات اور ان کے حقوق و فرائض کی تقسیم بھی اسی طبقاتی ساخت کی عکاس ہے۔

لوک ادب، بالخصوص لوریوں، بولیوں اور اکھانوں میں معاشی زندگی، رزق کی جستجو اور انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان لوک اصناف میں عام طور پر محنت کش طبقے کی خواہشات اور ضروریات نہایت محدود اور فطری صورت میں سامنے آتی ہیں۔ مزدور اور نچلے معاشی طبقے کے افراد کی بنیادی آرزو یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی روزمرہ ضروریات پوری کر سکیں اور زندگی کا نظام چلتا رہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دار طبقہ اپنی دولت میں مسلسل اضافہ کرتا ہے، اور اکثر اوقات یہ سرمایہ انہی محنت کش طبقات کی محنت اور استحصال کے نتیجے میں جمع ہوتا ہے۔ اس معاشی کشمکش نے مختلف طبقات کے درمیان ایک مستقل تناؤ کو جنم دیا ہے، جس کی جھلک لوک ادب کے مختلف نمونوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پنجابی لوریوں میں بھی طبقاتی تفاوت اور معاشی خواہشات کی نمائندگی ملتی ہے۔ ذیل کی لوری میں ایک خوش حال معاشی تصور اور دولت کے حصول کی آرزو کو نہایت سادہ اور عوامی انداز میں پیش کیا گیا ہے:

الھڑ بلھڑ باوے دا
باوا کنک لیاوے گا
باوی بہہ کے چھٹّے گی
سو روپئیا وٹّے گی[1]

اس لوری میں ”کنک“ (گندم) خوش حالی اور معاشی استحکام کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے، جبکہ ”سو روپیہ وٹّے گی“ سے مراد گندم کی صفائی اور فروخت کے نتیجے میں مالی منفعت کا حصول ہے۔ یوں یہ لوک روایت نہ صرف دیہی معاشی زندگی کی عکاسی کرتی ہے بلکہ عوامی ذہن میں معاشی خوش حالی کے تصور کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

پنجابی لوک ادب میں معاشی ضروریات، رزق کی تلاش اور طبقاتی شعور کے تصورات نہایت قدیم ہیں۔ اگرچہ کارل مارکس نے انیسویں صدی میں طبقاتی کشمکش (Class Struggle) اور معاشی استحصال کے نظریات کو باقاعدہ فلسفیانہ اور سائنسی بنیادوں پر پیش کیا، تاہم برصغیر کے لوک ادب میں

ان تصورات کی جڑیں اس سے ہزاروں سال پہلے تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پنجابی اکھان، بولیاں اور لوک روایتیں اس امر کی گواہ ہیں کہ عوامی سطح پر دولت، محنت، رزق اور معاشی تفاوت کے بارے میں شعور ہمیشہ موجود رہا ہے۔ یہ لوک اصناف نہ صرف معاشی حقائق کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ محنت، کاوش اور روزگار کے حصول کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔

پنجابی اکھانوں میں معاشی زندگی کے مختلف پہلو نہایت مختصر مگر مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

جیہدے گھر وچ دانے، اوہدے کملے وی سیانے[۲]

اس کہاوت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دولت اور وسائل رکھنے والے افراد معاشرے میں عزت، وقعت اور دانائی کے حامل سمجھے جاتے ہیں، خواہ ان کی ذاتی صلاحیتیں محدود ہی کیوں نہ ہوں۔

دب کے واہ تے رج کے کھاہ[۳]

یہ اکھان محنت، زراعت اور مسلسل جدوجہد کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پوری محنت اور دل جمعی سے کام کرو تاکہ خوش حالی اور آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کر سکو۔

بوہل سارا ویچ گھتیا، چھلّاں پندراں ہتھ نہ آئیاں[۴]

اس کہاوت میں معاشی نقصان، کاروباری خسارے یا غیر متوازن منافع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جہاں کثیر سرمایہ یا محنت صرف ہونے کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

ڈاڈھیاں دا ستیں ویہیں سو[۵]

یہ کہاوت طاقت ور اور بااثر طبقات کی معاشی برتری اور ان کے لیے موجود اضافی مواقع کی عکاسی کرتی ہے، جو اکثر کمزور طبقات کو میسر نہیں ہوتے۔

پنجابی ادب کی روایت میں ہر دور میں ایسے مفکرین، صوفیا اور شعرا پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے معاشی ناانصافی اور طبقاتی استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں بابا فرید الدین گنج شکر کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ بابا فرید نے اپنی شاعری میں ایک طرف غربت اور محرومی کا شکار طبقات کو صبر، قناعت اور توکل کی تلقین کی ہے اور دوسری طرف دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے اخلاقی اور روحانی

نتائج کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان کے نزدیک صبر محض بے بسی کا نام نہیں بلکہ ایک روحانی قوت ہے جو انسان کو مشکلات میں ثابت قدم رکھتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

رُکھی سُکی کھائِ کے، ٹھنڈا پانی پیئُ
فریدا دیکھ پرائی چوپڑی، نہ ترسائیں جیئُ[6]

اس شعر میں بابا فرید قناعت کے تصور کو اجاگر کرتے ہوئے انسان کو دوسروں کی آسائشوں اور نعمتوں پر حسرت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک روحانی سکون اور قلبی اطمینان مادی آسائشوں سے زیادہ اہم ہیں۔

تاہم بابا فرید صرف صبر کی تلقین تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ معاشرے میں موجود معاشی ناہمواری پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دنیا میں دولت اور وسائل کی تقسیم یکساں نہیں اور بعض لوگ بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں، جبکہ کچھ افراد ضرورت سے کہیں زیادہ وسائل کے مالک ہیں۔ اس صورتِ حال کا حساب آخرت میں لیا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں:

فریدا اِکناں آٹا اگلا، اِکناں ناہیں لون
اگے گئے سِنجاپسن، چوٹاں کھاسی کون[7]

اس شعر میں ''آٹا'' اور ''لون'' (نمک) بنیادی ضروریاتِ زندگی کی علامت ہیں۔ بابا فرید اس تضاد کو نمایاں کرتے ہیں کہ ایک طبقہ فراوانی میں زندگی بسر کر رہا ہے جبکہ دوسرا طبقہ بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہے۔ ان کے نزدیک یہ عدم مساوات ایک اخلاقی مسئلہ ہے جس کے بارے میں انسان کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔

اسی فکری روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے کلاسیکی پنجابی شاعر شاہ حسین نے بھی معاشی ناہمواری اور طبقاتی امتیاز کے خلاف اپنے احتجاج کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے کلام میں دولت کی غیر مساوی تقسیم، محروم طبقات کی بے بسی اور سرمایہ کی غیر متوازن گردش پر شدید تنقید ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اِکناں کھنّی توں ترساویں
اِک ونڈ دیندے نی ساریاں[8]

اس مصرعے میں رزق اور نعمتوں کی غیر مساوی تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جہاں بعض افراد بنیادی ضروریات سے محروم ہیں جبکہ بعض کے پاس فراوانی موجود ہے۔

ننگے پیریں جاندڑے ڈِٹھے
جِن کے لاکھ کروڑ[9]

یہ شعر اس سماجی تضاد کو نمایاں کرتا ہے کہ بے شمار دولت رکھنے والے افراد بھی بعض اوقات حقیقی انسانی ہمدردی اور سماجی ذمہ داری سے محروم ہوتے ہیں، جبکہ غریب طبقہ بنیادی سہولیات کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔

سارے ورھے اِک چھلی کتی
کاگ مریندا جُھٹی[10]

اس شعر میں محنت کش طبقے کی مسلسل جدوجہد اور اس کے مقابلے میں حاصل ہونے والے محدود ثمرات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

لکھ کروڑ جیہناں دے جُڑیا
سو بھی جُھوری جُھوری
بھٹھ پئی تیری چِٹی چادر
چنگی فقیراں دی بُھوری[11]

شاہ حسین اس شعر میں دولت کی ناپائیداری اور فقر کی معنوی عظمت کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بے شمار دولت جمع کر لینے کے باوجود انسان کو دائمی سکون حاصل نہیں ہوتا، جبکہ فقر، قناعت اور روحانی وابستگی انسان کو حقیقی اطمینان عطا کرتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی لوک ادب اور صوفیانہ شاعری میں معاشی ناہمواری، طبقاتی تفاوت، محنت کی قدر، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور انسانی مساوات جیسے موضوعات صدیوں سے زیرِ بحث رہے ہیں۔ یہ عناصر اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ طبقاتی شعور اور معاشی انصاف کا تصور محض جدید سیاسی و معاشی نظریات کا نتیجہ نہیں بلکہ برصغیر کی عوامی اور ادبی روایت کا بھی ایک اہم جزو رہا ہے۔

پنجابی کلاسیکی شاعری میں معاشی ناہمواری، طبقاتی تفریق اور استحصالی نظام کے خلاف احتجاج ایک نمایاں موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ پنجابی صوفی شعرا کا بنیادی موضوع عشقِ حقیقی، انسان دوستی، روحانی ارتقا اور اخلاقی اصلاح ہے، تاہم ان کے کلام میں اپنے عہد کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ بلھے شاہ، وارث شاہ اور میاں محمد بخش جیسے شعرا نے انسانی زندگی

کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور بالخصوص ان حالات پر تنقید کی جن میں معاشرے کے کمزور اور محنت کش طبقات معاشی استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں طبقاتی کشمکش (Class Conflict) اور معاشی ناانصافی کے خلاف ایک واضح احتجاجی لہجہ پایا جاتا ہے۔

بلھے شاہ کا عہد سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور سماجی بے چینی کا دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور مسلسل سیاسی کشمکش نے عام آدمی کی زندگی کو شدید متاثر کیا۔ کسان، مزدور اور نچلے طبقات بھاری مالی بوجھ، ٹیکسوں اور جاگیردارانہ استحصال کے باعث مشکلات کا شکار تھے۔ بلھے شاہ نے ان حالات کی عکاسی اپنے کلام میں علامتی انداز میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ایس کُسنبے دے چار مقدّم ،معاملہ منگدے بھاری
ہورناں چُگیا پھوہیا پھوہیا، میں بھر لئی پٹاری
میں کُسنبڑا چُگ چُگ ہاری

میں کُسنبڑا چُگ چُگ ہاری
چُگ چُگ کے میں ڈھیری کیتا، لتھے آن بپاری
اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا، سر پر گٹھڑی بھاری[۲]

اس کلام میں ''کُسنبڑا'' (کُسمبہ) محنت اور پیداوار کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے، جبکہ ''مقدّم'' اور ''بپاری'' استحصالی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو محنت کش طبقے کی پیداوار پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ شاعر اپنی مسلسل محنت اور مشقت کے باوجود معاشی آسودگی حاصل نہیں کر پاتا، کیونکہ پیداوار کا اصل فائدہ دوسرے طبقات سمیٹ لیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال مارکسی تصورِ استحصال (Exploitation) سے بھی مطابقت رکھتی ہے، جس کے مطابق محنت کش اپنی محنت کا مکمل معاوضہ حاصل نہیں کر پاتا۔

پنجابی شاعری میں معاشی مسائل کا اظہار صرف کافی، سی حرفی یا قصے تک محدود نہیں بلکہ جدید پنجابی غزل میں بھی یہ موضوع نمایاں طور پر موجود ہے۔ اگرچہ روایتی غزل کا بنیادی موضوع محبوب، عشق اور جذباتی وارداتیں رہی ہیں، تاہم جدید دور میں معاشی مشکلات، طبقاتی ناہمواری اور انسانی محرومی بھی غزل کے اہم موضوعات میں شامل ہو چکی ہیں۔ بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی حالات نے غزل کے

موضوعات کو بھی متاثر کیا ہے، جس کے نتیجے میں شاعر نے فرد کی معاشی بے بسی اور سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات کو اپنے اظہار کا حصہ بنایا ہے۔

پنجابی غزل کے صاحبِ دیوان شاعر مولا بخش کُشتہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے رحمی اور مادّہ پرستی پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کر رہیوں بالن اکٹھا تن بدن دے واسطے
مر رہیا ایں رات دِن جو کُوڑے دھن دے واسطے [۱۳]

اس شعر میں شاعر انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات اور دولت کے حصول کی بے انتہا خواہش کے درمیان فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ ایک طرف انسان اپنی جسمانی ضروریات پوری کرنے کے لیے محنت کر رہا ہے، جبکہ دوسری طرف وہ جھوٹی اور عارضی دولت کی خاطر اپنی پوری زندگی کھپا دیتا ہے۔ یہاں ''کُوڑا دھن'' سرمایہ پرستی اور مادّی حرص کی علامت ہے۔

اسی تصور کو ڈاکٹر رشید انور نے جدید معاشرے کی مصنوعی سماجی ساخت کے تناظر میں یوں بیان کیا ہے:

سامریاں دی جوہ وچ آکے کہنوں واجاں دینا ایں
پرچھاویں نیں سارے لوکی نال کسے سے سایا نہیں [۱۴]

اس شعر میں ''سامری'' فریب، دھوکے اور مصنوعی کشش کی علامت ہے۔ شاعر کے نزدیک جدید معاشرہ ظاہری تعلقات اور وقتی مفادات پر قائم ہے۔ لوگ بظاہر ایک دوسرے کے قریب دکھائی دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ محض ''پرچھاویں'' ہیں جن میں حقیقی ہمدردی، رفاقت اور سماجی وابستگی موجود نہیں۔ یہ کیفیت سرمایہ دارانہ معاشرے میں پیدا ہونے والی بیگانگی (Alienation) کی طرف اشارہ کرتی ہے، جسے کارل مارکس نے جدید صنعتی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ قرار دیا تھا۔

اسی طرح رئوف شیخ معاشی ناہمواری اور وسائل کی غیر مساوی تقسیم کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

محلاں والے ونڈیاں پان گے جُھگیاں والے سہکن گے
دریاواں وچ ہڑ آون گے نہراں سُکیاں رہن گئیاں [۱۵]

اس شعر میں "محل" اور "جھگیاں" دو مختلف معاشی طبقات کی علامت ہیں۔ شاعر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ قدرتی اور معاشی وسائل کی تقسیم اکثر غیر منصفانہ بنیادوں پر ہوتی ہے۔ خوش حال طبقہ وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے جبکہ محروم طبقات مشکلات اور محرومیوں کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ شعر کا دوسرا مصرعہ بھی اسی عدم توازن کی علامت ہے کہ جہاں ایک طرف دریا طغیانی کا شکار ہیں، وہاں دوسری طرف نہریں خشک پڑی ہیں۔ یہ منظر وسائل کی غیر مساوی تقسیم اور معاشرتی ناانصافی کا استعارہ بن جاتا ہے۔

مذکورہ شعری مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں معاشیات، طبقاتی تفاوت، استحصالی رویے اور سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات کو مختلف ادوار میں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ کلاسیکی صوفی شعرا سے لے کر جدید غزل گو شعرا تک ایک فکری تسلسل موجود ہے جو انسانی مساوات، معاشی عدل اور سماجی انصاف کی حمایت کرتا ہے۔ اس اعتبار سے پنجابی شاعری محض جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ اپنے عہد کے معاشی اور سماجی مسائل کی ایک مؤثر اور بامعنی دستاویز بھی ہے۔

پنجابی شاعری میں معاشی استحصال، طبقاتی تفاوت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا موضوع صرف کلاسیکی دور تک محدود نہیں بلکہ عصرِ حاضر کے شعرا بھی اس مسئلے کو اپنی تخلیقات میں نمایاں طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اگرچہ جدید دنیا خود کو ترقی یافتہ، مہذب اور انسانی حقوق کی پاسدار قرار دیتی ہے، تاہم معاشی ناہمواری، مزدور کے استحصال اور دولت کے ارتکاز جیسے مسائل آج بھی اسی شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ جدید پنجابی شاعر ڈاکٹر یونس احقر اپنے کلام میں اس تلخ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ معاشی ترقی کے ثمرات معاشرے کے تمام طبقات تک یکساں طور پر نہیں پہنچتے بلکہ محنت کش طبقہ اپنی محنت کے باوجود محرومی کا شکار رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ساڈے موڈھیاں اُتوں اوہناں لہن نہیں دِتی بھوری
ککھوں لکھ بنا گئی جنہاں نوں ساڈی مزدوری[۱۶]

اس شعر میں شاعر محنت کش طبقے کی معاشی بے بسی اور استحصالی نظام کی شدت کو بیان کرتا ہے۔ "ساڈی مزدوری" سے مراد وہ محنت ہے جس کی بدولت سرمایہ دار طبقہ معمولی وسائل سے کروڑوں کی دولت کا مالک بن جاتا ہے، جبکہ اصل محنت کرنے والے افراد بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہتے ہیں۔ شعر میں "بھوری" (بوجھ) ایک علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے جو مزدور طبقے پر مسلط

معاشی ذمہ داریوں اور مشکلات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس طرح شاعر سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہونے والی معاشی عدم مساوات کو موضوعِ سخن بناتا ہے۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ذاتی مفادات کے حصول کے لیے کمزور طبقات کے حقوق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ معاشی اور سیاسی طاقت رکھنے والے افراد اور طبقات اکثر ایسے فیصلے کرتے ہیں جن کے فوائد محدود طبقے تک پہنچتے ہیں، جبکہ ان کے منفی اثرات وسیع عوامی حلقوں کو برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اس حقیقت کو اکرام مجید نے اپنے شعری اظہار میں یوں پیش کیا ہے:

پیڑ کروڑاں جاناں دی
دین اے کجھ پردھاناں دی
کوکھ بھری اے دولت نال
تپدے ریگستاناں دی
کیہڑے بدّل کرنی اے
قسمت ہری کساناں دی[۱۷]

اس نظم میں شاعر معاشرتی اور معاشی طاقت کے ارتکاز پر تنقید کرتا ہے۔ ''کجھ پردھاناں'' سے مراد وہ بااثر افراد ہیں جو اپنے محدود مفادات کے لیے کروڑوں انسانوں کو مشکلات اور مصائب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ''کوکھ بھری اے دولت نال'' دولت کے غیر معمولی ارتکاز کی علامت ہے، جبکہ ''قسمت ہری کساناں دی'' زرعی اور محنت کش طبقات کی محرومی اور ناامیدی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ اشعار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معاشی ترقی کے دعووں کے باوجود زرعی اور مزدور طبقہ اکثر ترقی کے ثمرات سے محروم رہتا ہے۔

معاشی کشمکش، طبقاتی امتیاز اور استحصالی رویوں کا یہ موضوع قدیم دور سے لے کر موجودہ عہد تک پنجابی شاعری کا مستقل حصہ رہا ہے۔ بیسویں صدی کے شعرا نے بھی انسانی مساوات، معاشی انصاف اور طبقاتی استحصال کے خلاف بھرپور آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں شریف کنجاہی کی شاعری خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ انسانی برابری اور سماجی انصاف کے تصور کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظم ملاحظہ ہو:

جے میں آکھاں اسیں تسیں آں اِک آدم دے جائے
کیوں مُڑ اِک وگاراں کٹے تے اِک ویہلیاں کھائے

جے میں آکھاں دنیا اُتے بے گھر کوئی نہ ہووے
جے میں آکھاں بُڈھے ویلے ٹوکری نہ کوئی ڈھوئے
جے میں آکھاں مِسّا لُونا سارے رل کے کھایئے
اِکدوجے دیاں باہواں بنئیے نالے بھار ونڈایئے
تاں میں بھیڑا تاں میں جُھوٹا،میرے بول اوّلے
چنگ تہاڈی ہٹی وِکدا، سچ تہاڈے پلّے[۱۸]

اس نظم میں شاعر انسانی مساوات، معاشی عدل اور سماجی اشتراک کے تصور کو اجاگر کرتا ہے۔ ''اسیں تسیں آں اِک آدم دے جائے'' کے ذریعے تمام انسانوں کی بنیادی یکسانیت اور مشترک انسانی رشتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شاعر سوال اٹھاتا ہے کہ اگر تمام انسان ایک ہی اصل سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر ایک طبقہ مشقت اور مزدوری کا بوجھ کیوں اٹھائے جبکہ دوسرا طبقہ بغیر محنت کے وسائل سے فائدہ اٹھائے؟ نظم میں بے گھر افراد، ضعیف العمر مزدوروں اور وسائل کی غیر مساوی تقسیم جیسے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

شریف کنجاہی مزید ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کرتے ہیں جہاں لوگ مل جل کر وسائل استعمال کریں، ایک دوسرے کے بوجھ بانٹیں اور اجتماعی فلاح کو ترجیح دیں۔ تاہم شاعر اس امر پر افسوس کا اظہار بھی کرتا ہے کہ معاشرے میں حق اور انصاف کی بات کرنے والوں کو اکثر تنقید اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ مفاد پرستانہ سوچ کو قبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ان شعری مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، مزدور کے حقوق، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور انسانی مساوات جیسے موضوعات مسلسل زیرِ بحث رہے ہیں۔ کلاسیکی صوفی شاعری سے لے کر جدید اور مابعد جدید پنجابی شاعری تک ایک فکری تسلسل موجود ہے جو معاشی عدل، سماجی مساوات اور انسانی وقار کے تحفظ کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی شاعری محض جمالیاتی اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ اپنے عہد کے معاشی اور سماجی حقائق کی ایک معتبر فکری دستاویز بھی ہے۔

بیسویں صدی کی پنجابی شاعری میں طبقاتی شعور، معاشی ناہمواری اور محنت کش طبقے کے مسائل کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس عہد کے شعرا نے محض معاشرتی صورتِ حال کا بیان ہی نہیں کیا

بلکہ استحصالی نظام کے خلاف ایک فکری اور اخلاقی موقف بھی اختیار کیا۔ شریف کنجاہی ان شعرا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنہوں نے انسانی مساوات، سماجی انصاف اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کے تصورات کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کا جذبہ نمایاں ہے اور وہ ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کرتے ہیں جہاں تمام افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، ہمدردی اور مساوات کے اصولوں کے تحت زندگی گزاریں۔

شریف کنجاہی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ معاشرے کے کمزور، محروم اور پسماندہ طبقات کو ترقی کے سفر میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اجتماعی ذمہ داری کے تحت ان کا سہارا بننا چاہیے۔ وہ وسائل کو چند مخصوص طبقات کی ملکیت قرار دینے کے بجائے تمام انسانوں کا مشترکہ حق تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مزدور، کسان اور محروم انسان محض کردار نہیں بلکہ ایک فکری علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

محنت کش طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے شریف کنجاہی نے ایک نوجوان مزدور غلام محمد (گاما) کی زندگی کو نظم کا موضوع بنایا ہے۔ یہ نظم دراصل دیہی معاشرے کے ایک ایسے نوجوان کی داستان ہے جو غربت اور معاشی مجبوریوں کے باعث اپنی بے فکری اور نوجوانی کی خوشیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ شاعر اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

گاما ہن گاما نئیں ہن مزدور اے
ہن اوہ ویہلیاں دی نگری توں دُور اے
ٹوکریاں ڈھوئیاں ہاسے آپ ٹُک جاندے نیں[19]

اس نظم میں ''گاما'' ایک فرد نہیں بلکہ پورے محنت کش طبقے کی علامت ہے۔ شاعر یہ واضح کرتا ہے کہ معاشی مجبوری انسان کی فطری خوشیوں، خوابوں اور خواہشات کو کس طرح نگل لیتی ہے۔ ''ٹوکریاں ڈھوئیاں'' محنتِ شاقہ کی علامت ہے، جبکہ ''ہاسے آپ ٹُک جاندے نیں'' اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مسلسل جسمانی مشقت اور معاشی دباؤ انسان کے چہرے سے مسکراہٹ چھین لیتے ہیں۔ یوں یہ نظم جدید معاشرے میں مزدور کے وجودی اور معاشی المیے کی نمائندگی کرتی ہے۔

اسی طرح پنجابی کے معروف شاعر بشیر مُنذر نے اپنی نظم ''کلّا رُکھ'' میں کسان کی زندگی، اس کی محنت اور اس کے استحصال کی نہایت مؤثر تصویر کشی کی ہے۔ برصغیر کے زرعی معاشرے میں کسان

بنیادی پیداواری قوت کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اکثر معاشی بدحالی اور قرضوں کے بوجھ تلے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کسان پورا سال شدید گرمی، سردی اور موسمی سختیوں کا سامنا کرتے ہوئے زمین سے رزق پیدا کرتا ہے، لیکن فصل کی کٹائی کے وقت اس کی محنت کا بڑا حصہ جاگیردار، سرمایہ دار یا قرض خواہ اپنے قبضے میں لے لیتا ہے۔

بشیر مُنذر اس تلخ حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

اُچا سارا بوہل بنایا
محنت ساڈی مال پرایا
خالی ہتھ تے خالی کُکھاں
اپنی قسمت نرِیاں بُھکھاں [۲۰]

اس نظم میں "بوہل" (فصل کا ڈھیر) کسان کی محنت اور پیداوار کی علامت ہے، جبکہ "مال پرایا" اس استحصالی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں پیداوار کا اصل فائدہ کسی اور کو حاصل ہوتا ہے۔ شاعر اس المیے کو نمایاں کرتا ہے کہ بھرپور فصل پیدا کرنے کے باوجود کسان کے ہاتھ خالی رہتے ہیں اور اس کے حصے میں صرف بھوک، محرومی اور معاشی بے یقینی آتی ہے۔ یہ صورتِ حال معاشی استحصال کی ایک واضح مثال ہے جس میں محنت اور منافع کے درمیان توازن موجود نہیں رہتا۔

غربت، افلاس اور بھوک کے موضوعات کو اقبال صلاح الدین نے بھی اپنی شاعری میں نمایاں مقام دیا ہے۔ ان کی نظموں "کاما"، "راٹھ" اور "چَسّی" میں معاشرے کے محروم طبقات کی زندگی کو نہایت درد مندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً نظم "چَسّی" میں محنت کش انسان کی خاموش جدوجہد، صبر اور محرومی کو ایک مرثیے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ شاعر لکھتے ہیں:

ہر ہک راٹھ دی واری کیتی
دیہاں راتیں اوکھت بھوگی
موہوں اُپھ نہ کیتی
رزق اوہناں دے مونہوں ڈھٹھا
ودھیا گھٹیا جد وی ڈِھیجا کھادا
جیہڑا ڈھگا مُڈھوں لا ای

ہیٹھاں وگدا رہیا
ایویں ہیٹھاں وگدا رہسی
سِر کدی نہ چیسی
ڈاڈھا صبری ہوسی[21]

اس نظم میں شاعر محنت کش طبقے کے صبر، برداشت اور مسلسل محرومی کو موضوع بناتا ہے۔ ”رزق اوہناں دے مونہوں ڈھٹھا“ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ محنت کا پھل اکثر ان لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا جو اسے پیدا کرتے ہیں۔ ”ہیٹھاں وگدا رہیا“ معاشرتی اور معاشی دباؤ کے تحت مسلسل جھکے رہنے کی علامت ہے۔ شاعر کے نزدیک محنت کش انسان اپنے حالات پر احتجاج کرنے کے بجائے صبر اور خاموشی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے، اور یہی مجبوری استحصالی نظام کو مزید مضبوط کرتی ہے۔

ان شعری مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں مزدور، کسان اور دیگر محروم طبقات کی زندگی محض ایک ادبی موضوع نہیں بلکہ ایک سنجیدہ سماجی اور معاشی مسئلہ ہے۔ شریف کنجاہی، بشیر مُنذر اور اقبال صلاح الدین جیسے شعرا نے اپنے اپنے انداز میں اس طبقاتی کشمکش، معاشی ناانصافی اور انسانی محرومی کو اجاگر کیا ہے جو آج بھی ہمارے معاشرے کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ان کی شاعری انسانی مساوات، معاشی انصاف اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کے تصورات کو فروغ دیتی ہے اور اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ حقیقی سماجی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب محنت کش اور محروم طبقات کو ان کے جائز حقوق فراہم کیے جائیں۔

اگرچہ پنجابی صوفی شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے معاشرے کے محروم، غریب اور محنت کش طبقات کی دل جوئی کرنے، ان کے دکھ درد کو بیان کرنے اور انہیں صبر، قناعت اور حوصلے کی تلقین کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، تاہم معاشی استحصال اور طبقاتی تفاوت کی وہ کشمکش آج بھی بڑی حد تک اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں ماضی کے مختلف ادوار میں پائی جاتی تھی۔ جدید معاشی نظام میں بھی دولت اور وسائل کا بڑا حصہ محدود طبقے کے قبضے میں مرتکز ہے، جبکہ محنت کش طبقہ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے پر مجبور ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمائے، معاشی قوت اور وسائل کی بدولت آسودہ اور پُرتعیش زندگی بسر کرتا ہے، جبکہ مزدور طبقہ شدید موسمی

حالات، جسمانی مشقت اور معاشی دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنے اہلِ خانہ کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

کارل مارکس نے اسی معاشی ناہمواری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی مسئلہ قرار دیا تھا۔ مارکس کے مطابق جب سرمایہ اور ذرائع پیداوار چند افراد یا طبقات کے قبضے میں چلے جاتے ہیں تو معاشرے میں طبقاتی تقسیم گہری ہو جاتی ہے اور محنت کش طبقہ استحصال کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دولت کی منصفانہ تقسیم اور وسائل کی نچلی سطح تک مؤثر ترسیل معاشرتی توازن، معاشی مساوات اور سماجی استحکام کو فروغ دیتی ہے۔ جب دولت ایک مخصوص طبقے تک محدود ہو جائے اور اس کی گردش رک جائے تو اس کے منفی اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

اسی معاشی حقیقت کی طرف معروف پنجابی شاعر استاد دامن نے اپنے مخصوص عوامی اور انقلابی انداز میں توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ڈھڈ وچ روٹی اکھیں مستی جیبھاں وچ کرارہ پن
دِل نوں سُنجا کر جاندا اے مال متاع، دنیا دا دھن
بُھکھا لان دیہاڑی جاوے رکھے وچ خیالاں من
رجے پُجے نوں آجاندا طعنے مہنے دین دا فن[۲۲]

اس کلام میں استاد دامن معاشی ناہمواری کے نفسیاتی اور اخلاقی اثرات کو موضوع بناتے ہیں۔ شاعر کے مطابق دولت اور مادی وسائل انسان کو ظاہری آسودگی تو فراہم کر سکتے ہیں، لیکن ان کے حصول کی بے جا خواہش انسان کے باطن کو ویران اور بے سکون بنا دیتی ہے۔ دوسری جانب بھوکا اور محروم انسان روزگار اور رزق کی فکر میں زندگی بسر کرتا ہے، جبکہ آسودہ حال طبقہ اکثر اس کی مشکلات کا احساس کرنے کے بجائے اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے۔

استاد دامن کی شاعری میں مارکسی فکر کے مختلف عناصر نمایاں طور پر موجود ہیں۔ خصوصاً خوراک، محنت اور پیداوار کے مسائل ان کے ہاں بار بار موضوع بنتے ہیں۔ وہ ایک مقام پر کہتے ہیں:

دامن مسئلہ خوراک تے بحث کردے
روٹی آپ نیں کھاندے تندور اُتوں[۲۳]

اس شعر میں شاعر ان طبقات پر تنقید کرتا ہے جو معاشی مسائل پر گفتگو تو کرتے ہیں، لیکن عملی طور پر ان مسائل کا سامنا نہیں کرتے۔ ''روٹی آپ نیں کھاندے تندور اُتوں'' اس حقیقت کی علامت ہے کہ پالیسی سازی اور نظری مباحث میں شریک افراد اکثر ان مشکلات سے ناواقف ہوتے ہیں جن کا سامنا عام مزدور اور محنت کش طبقہ روزانہ کی بنیاد پر کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ دولت اور وسائل کی ملکیت طاقت اور اختیار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جب سرمایہ دار طبقہ معاشی وسائل پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ اپنی معاشی قوت کو مزید بڑھانے کے لیے کمزور طبقات کا استحصال کرتا ہے۔ اس عمل میں انسانی ہمدردی، اخلاقی اقدار اور سماجی انصاف اکثر پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ استاد دامن اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تگڑا ماڑے اُتے اپنا بھار پاوے
ایہدی لاش دا کُھرا نہ دِسدا اے
وچو وچ ای جان ہے نِکل جاندی
وگدا خون نہ پھٹ وی دِسدا اے[۲۴]

اس شعر میں ''تگڑا'' اور ''ماڑا'' بالترتیب طاقت ور اور کمزور طبقے کی علامت ہیں۔ شاعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ استحصال ہمیشہ ظاہری تشدد کی صورت میں نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات معاشی اور سماجی دباؤ اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی رفتہ رفتہ تحلیل ہوتی رہتی ہے، مگر اس ظلم کی کوئی واضح ظاہری شکل دکھائی نہیں دیتی۔ یہ تصور جدید معاشیات میں ''ساختی استحصال '' (Structural Exploitation) کے تصور سے قریب تر ہے، جہاں ظلم اور ناانصافی نظام کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔

دولت کی بے پناہ خواہش اور سرمایہ جمع کرنے کی انسانی حرص کو پنجابی شاعر تنویر ظہور نے اپنی نظم ''بندہ تے ڈنگر'' میں نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعر انسان اور حیوان کے درمیان ایک اخلاقی تقابل قائم کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ حیوان اپنی ضرورت پوری ہونے پر مطمئن ہو جاتا ہے، جبکہ انسان کی لالچ اور حرص اکثر لامحدود صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بندہ سو نعمتاں اگے رکھ کے کھاوے
فیر وی اوہدی بُھکھ نہ لتھے

جے ڈِھڈ دی بُھکھ لتھ جاوے
تاں وی اکھ بُھکھی دی بُھکھی
کھوہ کھنجھ کے جوڑن والا لالچ ناہیں مُکے
ہور سمیٹے، جوڑی جاوے
لالچ ناہیں مُکے
فیر وی ہر مخلوق توں ویکھو اشرف پیا کہاوے
ڈنگر فیر ڈنگر دا ڈنگر[۲۵]

اس نظم میں شاعر انسانی نفسیات کے ایک اہم پہلو، یعنی حرص و ہوس، کو موضوع بناتا ہے۔ ''ڈِھڈ دی بُھکھ'' جسمانی ضرورت کی علامت ہے، جبکہ ''اکھ بُھکھی دی بُھکھی'' مادی لالچ اور غیر محدود خواہشات کی نمائندگی کرتی ہے۔ شاعر کے مطابق انسان اپنی بنیادی ضروریات پوری ہونے کے باوجود مزید دولت، وسائل اور طاقت کے حصول کی خواہش سے دست بردار نہیں ہوتا۔ یہی حرص سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ اور معاشی عدم مساوات کے تسلسل کا ایک اہم سبب بنتی ہے۔

ان شعری مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور انسانی حرص و لالچ جیسے موضوعات مستقل طور پر زیرِ بحث رہے ہیں۔ صوفی شعرا سے لے کر جدید عوامی اور انقلابی شعرا تک ایک فکری تسلسل موجود ہے جو انسانی مساوات، معاشی عدل اور سماجی انصاف کے اصولوں کی حمایت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی شاعری نہ صرف اپنے عہد کے سماجی اور معاشی حقائق کی عکاس ہے بلکہ ایک ایسے معاشرے کے خواب کی ترجمان بھی ہے جس میں وسائل کی منصفانہ تقسیم اور انسانی وقار کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے تناظر میں صرف سرمایہ دار طبقہ ہی استحصالی رویّوں کا مظہر نہیں بنتا بلکہ بعض اوقات ریاستی اور انتظامی ڈھانچے بھی ایسے عوامل کو تقویت دیتے ہیں جو معاشی عدم مساوات میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ جب حکومتی ادارے اور انتظامی اہل کار عوامی فلاح کے بجائے مخصوص مفادات کے تحفظ کو ترجیح دینے لگیں تو وسائل کی منصفانہ تقسیم متاثر ہوتی ہے اور محنت کش طبقہ مزید مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالخصوص ترقی پذیر معاشروں میں یہ مسئلہ زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے، جہاں ٹیکسوں کا بوجھ نسبتاً کم آمدنی والے طبقات پر منتقل کر دیا جاتا ہے، جبکہ وسائل اور مراعات کا

بڑا حصہ بالائی طبقات تک محدود رہتا ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محنت اور پیداوار میں بنیادی کردار ادا کرنے والے افراد کی معاشی حالت نسل در نسل بڑی حد تک تبدیل نہیں ہو پاتی۔

اسی حقیقت کی طرف فیض احمد فیض نے اپنے پنجابی کلام میں اشارہ کرتے ہوئے اقتدار اور انتظامی بدعنوانی کے باہمی تعلق کو نمایاں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کِتے دھونس دھتکار سرکار دی اے
کِتے دھاندلی مال پٹوار دی اے[۲۶]

اس شعر میں "سرکار" اور "پٹوار" محض انتظامی اداروں کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ اس پورے ریاستی اور معاشرتی ڈھانچے کی علامت ہیں جس میں طاقت اور اختیار رکھنے والے طبقات اپنی حیثیت کو عوامی مفاد کے بجائے ذاتی یا طبقاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک عوامی استحصال صرف معاشی قوت کے ذریعے نہیں بلکہ انتظامی اور قانونی ذرائع سے بھی جاری رہتا ہے۔

جدید پنجابی شاعری میں بعض شعرا نے موجودہ معاشرتی صورتِ حال کے مقابلے میں ایک ایسے مثالی معاشرے (Ideal Society) کا تصور بھی پیش کیا ہے جہاں انسانی تعلقات نفرت، استحصال اور معاشی حرص سے پاک ہوں۔ ادبیات میں ایسے تصور کو عموماً "یوٹوپیا (Utopia)" کہا جاتا ہے۔ یوٹوپیا سے مراد ایک ایسا مثالی معاشرہ ہے جہاں عدل، مساوات، امن اور انسانی فلاح اپنے کامل ترین درجے میں موجود ہوں۔ اگرچہ عملی دنیا میں ایسا معاشرہ مکمل صورت میں موجود نہیں ہوتا، تاہم یہ تصور انسان کو بہتر سماجی نظام کی جستجو پر آمادہ کرتا ہے۔

پنجابی شاعر طارق عزیز نے اپنی نظم "یوٹوپیا" میں ایسے ہی ایک مثالی معاشرے کا خواب پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یوٹوپیا

جی چاہندا اے موت توں پہلاں
ایسا نگر میں ویکھاں
جس دے باسی اِک دوجے نال
ذرا نہ نفرت کردے ہون
جس دے حاکم زر دے پچھے

سپّاں وانگ نہ لڑدے ہون
جتھے لوکیں مرن توں پہلاں
روز روز نہ مردے ہون[۲۷]

اس نظم میں شاعر ایک ایسے معاشرے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جہاں انسان ایک دوسرے کے ساتھ محبت، احترام اور اخوت کے رشتے میں بندھے ہوں، جہاں حکمران طبقہ دولت اور اقتدار کے حصول کے لیے باہمی کشمکش میں مبتلا نہ ہو، اور جہاں عوام معاشی، نفسیاتی اور سماجی دباؤ کے باعث روزانہ کی بنیاد پر اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوں۔ ''مرن توں پہلاں روز روز نہ مردے ہون'' ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے جو معاشی محرومی، سماجی بے بسی اور انسانی تذلیل کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسی تناظر میں بعض جدید پنجابی شعرا کارل مارکس کو ایک ایسے مفکر کے طور پر پیش کرتے ہیں جس نے معاشی ناانصافی اور طبقاتی استحصال کے خلاف مؤثر فکری مزاحمت فراہم کی۔ ان کے نزدیک مارکس کا تصورِ مساوات اور طبقاتی استحصال کے خاتمے کا نظریہ ایک زیادہ منصفانہ معاشرتی نظام کی تشکیل میں معاون ہو سکتا ہے۔

احمد سلیم نے اپنی نظم ''کارل مارکس'' میں مارکس کی شخصیت کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر کے نزدیک کارل مارکس ایک ایسے خوش حال اور متوازن معاشرے کا استعارہ ہے جس میں انسانی مسکراہٹ دولت اور جبر کے بجائے عدل اور مساوات کی بنیاد پر قائم ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

کارل مارکس

ساوے پتّر سوہے پُھلاں نوں جی آئیاں نوں کہندے
ساڈی سانجھ پرانی
چِیکاں دے دریا تے ہاسا پُل بنیا سی
ہاسا زر دا
ہاسا زور زبر دا[۲۸]

اس نظم میں ''ساوے پتّر'' خوش حالی، نمو اور اجتماعی زندگی کی علامت ہیں، جبکہ ''سوہے پُھل'' امید، خوب صورتی اور انسانی فلاح کے استعارے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ''چِیکاں دے دریا''

معاشرے میں موجود مظالم، محرومیوں اور استحصالی نظام کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جبکہ "ہاسائیں بنیا سی" ایک ایسے فکری اور انقلابی تصور کی علامت ہے جو ان محرومیوں اور اذیتوں کے درمیان امید اور نجات کا راستہ فراہم کرتا ہے۔

احمد سلیم کے نزدیک مارکس کا فکری کردار محض ایک فلسفی یا ماہرِ معاشیات کا نہیں بلکہ ایک ایسے مفکر کا ہے جس نے معاشرتی ناانصافی، طبقاتی استحصال اور دولت کے غیر منصفانہ ارتکاز کے خلاف ایک نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ اس نظم میں "ہاسازر دا" اور "ہاسازور زبر دا" کے ذریعے شاعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام میں خوش حالی اور مسرت اکثر دولت اور طاقت کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے، جبکہ محروم طبقات ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔

ان شعری مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، ریاستی ناانصافی، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور ایک مثالی معاشرے کی جستجو جیسے موضوعات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ جدید پنجابی شعرا نے ان موضوعات کو نہ صرف فکری اور تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے بلکہ ان کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کا خواب بھی دکھایا ہے جہاں انسانی وقار، معاشی مساوات اور سماجی انصاف کو بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل ہو۔

پنجابی شاعری میں کسان، مزدور اور دیگر محنت کش طبقات کی معاشی مشکلات کو ہمیشہ خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص جدید پنجابی شاعری میں زرعی معیشت سے وابستہ مسائل، کسانوں کے استحصال، قرض کے بوجھ اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دیہی معاشرے میں کسان بنیادی پیداواری قوت کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اکثر معاشی استحکام سے محروم رہتا ہے۔ کاشت کاری کے عمل میں کسان کو بیج، کھاد، آب پاشی، زرعی ادویات، بوائی اور کٹائی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے قرض لینا پڑتا ہے۔ فصل تیار ہونے کے بعد اس کی آمدنی کا بڑا حصہ انہی قرضوں کی ادائیگی میں صرف ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں کسان کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت محدود وسائل باقی رہ جاتے ہیں۔

اس معاشی المیے کی عکاسی معروف پنجابی ادیب اور شاعر افضل احسن رندھاوا نے نہایت مؤثر انداز میں کی ہے۔ وہ کسان کی اس نفسیاتی اور معاشی کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس میں وہ سارا سال محنت کرنے کے باوجود اپنی پیداوار پر مکمل اختیار نہیں رکھتا۔ شاعر لکھتے ہیں:

کنکاں نکیاں

جٹ بوہل نوں مِن مِن گِن دا پَنڈاں بھاریاں
چَک لئیاں قرضے والیاں گِن گِن ساریاں
جٹ اندروں روئے، اُتوں بھرے کلکاریاں
گھر جٹیاں فصل اُڈیکن بیٹھیاں ہاریاں[۲۹]

اس نظم میں ''بوہل'' (فصل کا ڈھیر) کسان کی سال بھر کی محنت، امیدوں اور معاشی بقا کی علامت ہے۔ شاعر بیان کرتا ہے کہ کسان اپنی فصل کے ڈھیروں کو گن گن کر خوش ہوتا ہے، لیکن قرض خواہوں کی آمد کے بعد وہی فصل اس کی نظروں کے سامنے اٹھالی جاتی ہے۔ ''جٹ اندروں روئے، اُتوں بھرے کلکاریاں'' ایک نہایت مؤثر نفسیاتی منظر پیش کرتا ہے، جس میں کسان بظاہر خوشی کا اظہار کرتا ہے لیکن اندر سے شکستہ اور پریشان ہوتا ہے۔ دوسری طرف گھر کے افراد، خصوصاً عورتیں اور بچے، فصل سے وابستہ امیدیں لگائے بیٹھے ہوتے ہیں، مگر آخر کار انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ نظم دیہی معیشت میں موجود اس استحصالی نظام کی عکاسی کرتی ہے جس میں پیداوار کا اصل فائدہ اکثر قرض فراہم کرنے والے یا سرمایہ رکھنے والے طبقات کو حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح پنجابی کے ممتاز شاعر نجم حسین سید نے معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم، انسانی تفاوت اور معاشرتی رشتوں کی پیچیدگیوں کو اپنی منفرد علامتی اور فکری شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ نجم حسین سید کی شاعری میں طبقاتی فرق صرف معاشی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اسے انسانی وجود، سماجی رویّوں اور تہذیبی ساخت کے تناظر میں بھی دیکھتے ہیں۔ ان کی ایک کافی ملاحظہ ہو:

تیریاں پائیاں میں بُجھاں
میریاں بجھیں تُوں
کوئی کپاہ کوئی رُوں
تُدھ پہریں مینڈا سِپ اَن سپیا
اُدھڑ اُن تینڈی جیو جامہ میں کوں
جَگ آئے جُگ اساں ای ہاں
کہ کیڑیاں ہور کروڑ وی نیں
بگلاں ای نہیں وچ چور وی نیں[۳۰]

اس کافی میں شاعر انسانی معاشرے کے مختلف طبقات اور ان کے باہمی تعلقات کو علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ ''کوئی کپاہ کوئی رُوں'' اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان معاشرتی اور معاشی اعتبار سے یکساں حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ مختلف حالات، مواقع اور وسائل کی بنیاد پر ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ تاہم شاعر اس تفاوت کے باوجود باہمی تفہیم اور شراکت داری کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

''تیریاں پائیاں میں بُجھاں، میریاں بجھیں تُوں'' کے ذریعے شاعر ایک ایسے سماجی تعلق کی وکالت کرتا ہے جس میں افراد ایک دوسرے کے مسائل اور مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ تصور معاشرتی یک جہتی (Social Solidarity) اور اجتماعی شعور کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح آخری مصرعوں میں شاعر اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ معاشرتی زندگی محض ظاہری تقسیمات پر مشتمل نہیں بلکہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے اندر مختلف قسم کے مفادات، تضادات اور رویّے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ''بگلاں ای نہیں وچ چور وی نیں'' انسانی معاشرے کے انہی پیچیدہ اور متضاد پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ان شعری مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جدید پنجابی شاعری میں کسانوں کے معاشی مسائل، قرض کے بوجھ، طبقاتی تفاوت، وسائل کی غیر مساوی تقسیم اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو نہایت گہرائی کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔ افضل احسن رندھاوا اور نجم حسین سید جیسے شعرا نے محض معاشی حقائق کی تصویر کشی ہی نہیں کی بلکہ ان کے پس منظر میں کار فرما سماجی اور نفسیاتی عوامل کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اس اعتبار سے پنجابی شاعری معاشی اور سماجی شعور کی تشکیل میں ایک مؤثر ادبی اور فکری کردار ادا کرتی ہے اور انسانی مساوات، انصاف اور اجتماعی ذمہ داری کے تصورات کو تقویت فراہم کرتی ہے۔

جدید پنجابی شاعری میں طبقاتی کشمکش، معاشی ناہمواری اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے اثرات ایک نمایاں موضوع کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسئلہ جدید دور میں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے، تاہم انسانی تاریخ کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وسائل کی غیر مساوی تقسیم، معاشی تفاوت اور طبقاتی امتیاز مختلف ادوار میں مختلف صورتوں میں موجود رہے ہیں۔ پنجابی شاعری، بالخصوص صوفی، عوامی اور ترقی پسند شعری روایت، اس کشمکش کی مسلسل عکاسی کرتی رہی ہے اور اس کے اسباب و نتائج کو مختلف زاویوں سے بیان کرتی ہے۔

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ پنجابی کلاسیکی اور جدید شاعری میں معاشی استحصال، مزدور اور کسان کی محرومیاں، دولت کا غیر متوازن ارتکاز، اور طبقاتی تقسیم جیسے موضوعات نہایت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ پنجابی شعرا نے نہ صرف ان مسائل کی نشاندہی کی بلکہ انسانی مساوات، معاشرتی انصاف اور باہمی تعاون پر مبنی ایسے اصول بھی پیش کیے جو ایک متوازن معاشرے کی تشکیل میں معاون ہو سکتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے تناظر میں معاشی عدل (Economic Justice) کو ایک بنیادی سماجی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآنِ مجید اور اسلامی معاشرتی نظام دولت کی گردش (Circulation of Wealth)، ضرورت مند طبقات کی کفالت اور وسائل کی منصفانہ تقسیم پر زور دیتے ہیں۔ زکوٰۃ، صدقات، فطرانہ اور دیگر رفاہی احکامات کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ دولت صرف مخصوص طبقات تک محدود نہ رہے بلکہ معاشرے کے کمزور اور محروم افراد بھی اس سے مستفید ہوں۔ زکوٰۃ کو اسلامی معاشی نظام کا ایک اہم ستون قرار دیا گیا ہے، جو نہ صرف معاشی تطہیر بلکہ معاشرتی توازن اور اجتماعی فلاح کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

پنجابی صوفی شعرا نے بھی اپنی شاعری میں اسی تصورِ عدل و مساوات کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ اور دیگر صوفی شعرا نے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، انسانی استحصال اور معاشرتی ناانصافی پر تنقید کرتے ہوئے محبت، اخوت، قناعت اور انسانی مساوات کی تعلیم دی ہے۔ ان کے نزدیک ایک ایسا معاشرہ مثالی قرار پاتا ہے جس میں انسان کو اس کی محنت کا مناسب صلہ ملے اور معاشی وسائل چند افراد کے بجائے اجتماعی فلاح کے لیے استعمال ہوں۔

مزید برآں، جدید پنجابی شاعری میں بھی یہی فکری تسلسل برقرار نظر آتا ہے۔ جدید شعرا نے سرمایہ دارانہ نظام کے منفی اثرات، مزدور اور کسان کی محرومیوں، ریاستی اور انتظامی ناانصافیوں اور طبقاتی تضادات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان کے ہاں معاشی مسائل محض اقتصادی مباحث نہیں بلکہ انسانی وقار، سماجی مساوات اور اخلاقی ذمہ داری کے سوالات سے جڑے ہوئے ہیں۔

اس تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پنجابی شاعری معاشرتی اور معاشی شعور کی تشکیل میں ایک مؤثر فکری وسیلہ رہی ہے۔ اس شاعری نے نہ صرف طبقاتی کشمکش اور معاشی ناانصافی کی نشاندہی کی بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے عدل، مساوات، اخوت اور اجتماعی ذمہ داری جیسے اصول بھی پیش کیے

ہیں۔ چنانچہ پنجابی شاعری کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ ایک پائیدار اور متوازن معاشرے کی تشکیل صرف معاشی ترقی سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے معاشرتی انصاف، وسائل کی منصفانہ تقسیم اور انسانی وقار کے تحفظ کو بھی بنیادی اہمیت دینا ضروری ہے۔

لہٰذا پنجابی شعری روایت میں پیش کیے گئے یہ تصورات آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور عصرِ حاضر کے معاشی و سماجی مسائل کے فہم اور ان کے حل کے سلسلے میں قابلِ قدر فکری رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

حوالہ جات و حواشی

---

۱ بخاری، تنویر۔ لوک گیت۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۰۔
Bukhari, Tanvir. *Lok Geet*. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1980, 46.

۲ ملک، شہباز۔ پنجابی کہاوتیں۔ لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۷۔
Malik, Shahbaz. *Punjabi Kahawatan*. Lahore: Maktaba Meri Library, 1977, 99.

۳ ملک، شہباز۔ پنجابی کہاوتیں۔ لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۷۔
Malik, Shahbaz. *Punjabi Kahawatan*. Lahore: Maktaba Meri Library, 1977, 74.

۴ بخاری، تنویر۔ لوک گیت۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۰۔
Bukhari, Tanvir. *Lok Geet*. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1980, 26.

۵ ڈار، سیف الرحمن۔ رُکھ تاں ہرے بھرے۔ لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۵۔
Dar, Saif ur Rahman. *Rukh Tan Hare Bhare*. Lahore: Pakistan Punjabi Adabi Board, 1985, 246.

۶ بابا فرید۔ آکھیا بابا فرید نے۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹۔
Baba Farid. *Aakhya Baba Farid Nay*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1989, 172.

۷ بابا فرید۔ آکھیا بابا فرید نے۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹۔
Baba Farid. *Aakhya Baba Farid Nay*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1989, 187.

۸ شاہ حسین۔ کافیاں شاہ حسین۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۸۔
Shah Hussain. *Kafian Shah Hussain*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore:

Pakistani Punjabi Adabi Board, 1998, 65.

۹ شاہ حسین۔ کافیاں شاہ حسین۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۸۔
Shah Hussain. *Kafian Shah Hussain*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1998, 109.

۱۰ شاہ حسین۔ کافیاں شاہ حسین۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۸۔
Shah Hussain. *Kafian Shah Hussain*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1998, 119.

۱۱ شاہ حسین۔ کافیاں شاہ حسین۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۸۔
Shah Hussain. *Kafian Shah Hussain*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 1998, 59.

۱۲ بلھے شاہ۔ آکھیا بلھے شاہ نے۔ مرتبہ محمد آصف خاں۔ لاہور: پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، ۲۰۰۶۔
Bulleh Shah. *Aakhya Bulleh Shah Nay*. Edited by Muhammad Asif Khan. Lahore: Pakistani Punjabi Adabi Board, 2006, 345.

۱۳ کشتہ، مولا بخش۔ دیوانِ کشتہ۔ ایڈیٹر محمد افضل خاں۔ لاہور: بک شاپ، سنِ اشاعت ندارد۔
Kushta, Maula Bakhsh. *Diwan-e-Kushta*. Edited by Muhammad Afzal Khan. Lahore: Book Shop, n.d., 88.

۱۴ انور، رشید۔ یاداں۔ لاہور: کتاب خانہ دانشوراں، ۱۹۷۵۔
Anwar, Rashid. *Yadan*. Lahore: Kitab Khana Danishwaran, 1975, 81.

۱۵ شیخ، رؤف۔ چُپ دا زہر۔ لاہور: ادارہ پنجاب رنگ، ۱۹۸۳۔
Sheikh, Rauf. *Chup Da Zehr*. Lahore: Idara Punjab Rang, 1983, 141.

۱۶ احقر، یونس۔ وکھ اُڈاری لگے۔ لاہور: پنجابی فاؤنڈیشن لوئر مال، ۲۰۰۹۔
Ahqar, Younas. *Wakh Udari Lage*. Lahore: Punjabi Foundation, Lower Mall, 2009, 135.

۱۷ مجید، اکرام۔ تنے دا روگ۔ فیصل آباد: قرطاس، ۱۹۸۴۔
Majeed, Ikram. *Tanay Da Rog*. Faisalabad: Qirtas, 1984, 112–113.

۱۸ کنجاہی، شریف۔ جگراتے۔ لاہور: اے ایچ پبلشرز، ۱۹۹۵۔
Kunjahi, Sharif. *Jagratay*. Lahore: A.H. Publishers, 1995, 35–36.

۱۹ کنجاہی، شریف۔ جگراتے۔ لاہور: اے ایچ پبلشرز، ۱۹۹۵۔
Kunjahi, Sharif. *Jagratay*. Lahore: A.H. Publishers, 1995, 67.

۲۰ مُنذر، بشیر۔ کلّا رُکھ۔ لاہور: شعاعِ ادب، ۱۹۶۹۔
Munzar, Bashir. *Kalla Rukh*. Lahore: Shua-e-Adab, 1969, 56.

۲۱ صلاح الدین، اقبال۔ بار دی سار۔ لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۷۶۔
Salahuddin, Iqbal. *Bar Di Sar*. Lahore: Universal Books, 1976, 72–74.

۲۲ دامن، اُستاد۔ دامن دے موتی۔ مدون وحید مرزا۔ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۳۔
Daman, Ustad. *Daman Day Moti*. Compiled by Waheed Mirza. Lahore: Ferozsons Limited, 1993, 151.

۲۳ دامن، اُستاد۔ دامن دے موتی۔ مدون وحید مرزا۔ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۳۔

Daman, Ustad. *Daman Day Moti*. Compiled by Waheed Mirza. Lahore: Ferozsons Limited, 1993, 150.

۲۴ دامن، اُستاد۔ دامن دے موتی۔ مدون وحید مرزا۔ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۳۔

Daman, Ustad. *Daman Day Moti*. Compiled by Waheed Mirza. Lahore: Ferozsons Limited, 1993, 155.

۲۵ ظہور، تنویر۔ جیون پُلصراط۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، سنِ اشاعت ندارد۔

Zahoor, Tanvir. *Jeevan Pul Sirat*. Lahore: Sheikh Ghulam Ali & Sons Publishers, n.d., 39.

۲۶ فیض، فیض احمد۔ رات دی رات۔ لاہور: پیپلز پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۵۔

Faiz, Faiz Ahmad. *Raat Di Raat*. Lahore: Peoples Publishing House, 1975, 18.

۲۷ عزیز، طارق۔ ہمزاد داڈکھ۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸۔

Aziz, Tariq. *Hamzad Da Dukh*. Lahore: Al-Hamd Publications, 2008, 155.

۲۸ سلیم، احمد۔ اِک اُدھڑی کتاب دے بے ترتیبے ورقے۔ لاہور: کُونج پبلیکیشنز، ۲۰۰۵۔

Saleem, Ahmad. *Ik Udhri Kitab Day Bay Tarteeb Warqay*. Lahore: Koonj Publications, 2005, 16.

۲۹ رندھاوا، افضل احسن۔ چھیواں دریا۔ فیصل آباد: فیصل آباد آرٹس کونسل، ۱۹۹۷۔

Randhawa, Afzal Ahsan. *Chhevan Darya*. Faisalabad: Faisalabad Arts Council, 1997, 160.

۳۰ سید، نجم حسین۔ اِکناں ناہیں لَون۔ لاہور: رُت لیکھا، ۲۰۰۵۔

Syed, Najm Hussain. *Iknan Nahin Laun*. Lahore: Rut Lekha, 2005, 56.